© rasailojaraid.com

اب اس کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ خلق عالم کا مقصود اور مخلوقات کا سردار اپنے اصل مالک کے سامنے اپنی زندگی اور عبودیت اور غلامی کا اقرار کرے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش کی غرض بتا دی ہے :

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ۔

مَیں نے انسان اور جنّ کو اسی لئے بنایا کہ وہ میری بندگی کریں ۔

اس کی حیثیت اس ایجنٹ کی ہے جس کا فرض صرف اپنے مالک کے احکام کی تنفیذ ہے اس کے ہاتھ میں شریعتِ الٰہی کا فرمان ہے، اس کے احکام کو خود بجا لانا اور ساری دُنیا کو اس کے بجا لانے پر آمادہ کرنا اس کا سب سے بڑا فرض ہے۔ وہ صرف اپنے مالک کی مرضی کا تابع اور اُس کے حکم کا بندہ ہے ۔

© rasailojaraid.com

Fikr-o-Nasar (Islamabad) 20:9-10 (1983)
© rasailojaraid.com

نفاذ شریعت قیام پاکستان کا محرک

ظفر اللہ بیگ

پاکستان کسی اچانک حادثہ کی پیداوار نہیں بلکہ اس کا قیام ایک طویل صبر آزما اور مسلسل جدو جہد کا نتیجہ ہے اس کے لئے مسلمانوں کو بے پناہ جانی اور مالی قربانیاں دینی پڑیں۔ مسلمانوں نے یہ قربانیاں کیوں دیں؟ انہوں نے تقسیم ملک اور پاکستان کا مطالبہ کیوں کیا؟ اور وہ محرکات کیا تھے جو مطالبہ پاکستان کا سبب بنے؟ ان سوالات کے جواب میں ہمیں ہندوستان کے مذہبی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی حالات کا جائزہ لینا ہوگا۔

کانگرس اور اس کے حاشیہ نشین عناصر اس بات کے دعویدار تھے کہ دو قومی نظریہ چند مفاد پرست مسلمانوں نے مذہب کی آڑ لے کر اپنے مقاصد کے حصول کے لئے اختراع کیا ہے۔ بعض لوگوں نے اسے انگریز کی "تقسیم کرو اور حکومت کرو" کی پالیسی کا نتیجہ قرار دیا۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ زبان، مذہب اور ثقافت کے تفرقات سطحی ہیں۔ ان سطحی تفرقات کے نیچے ہندوستانی قومیت اور اتحاد کا واضح تصور موجود ہے جس کی بنیاد پر ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی متحدہ حکومت قائم کی جا سکتی ہے۔

اسلام چند عقائد اور مذہبی فرائض تک محدود محض ایک مذہب ہی نہیں بلکہ قرآن کریم کے مطابق ایک مکمل دین ہے یعنی ایک مکمل ضابطہ حیات جس کا تعلق ایک فرد کی انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم کی زندگیوں سے ہے جو قانون خداوندی کی روشنی میں زندگی کے ہر موڑ پر انسان کی راہنمائی کرتا ہے۔ مکہ میں اسلام جب اپنے یہ فرائض کما حقہ ادا نہ کر سکا تو مسلمانوں نے مدینہ جیسے محفوظ مقام کی طرف ہجرت کی۔ یہاں رسول کریمؐ کو سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کو منظم کر کے ایک اسلامی ریاست کے قیام کا موقع ملا۔ جہاں پہلی دفعہ اسلامی آئین و قانون کا نفاذ ہوا جہاں قرآنی اصولوں کے مطابق اسلامی معاشرے کی تشکیل ہوئی۔ مکہ کے ماحول میں یہ سب کچھ ہونا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ناممکن تھا اس لئے کہ مسلمان اقلیت میں تھے اور ایک مظلوم اور ستم رسیدہ قوم تھے اور اپنے دین کے مطابق زندگی بسر نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ ہجرت کے بعد مدینہ میں جب رسولِ کریمؐ نئی اسلامی ریاست کے سربراہ بنے تو نماز باجماعت، اذان، مساجد کی تعمیر، امتناعِ شراب و قمار بازی کے احکام اور وہ تمام قوانین جن کا تعلق مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی سے تھا، رائج کئے گئے اور مسلمان چند مظلوم اور منتشر فدائیانِ دینِ حق کی بجائے ایک منظم قوم بن گئے۔

الغرض ہجرت نے مسلمانوں پر یہ واضح کر دیا کہ اسلام میں قومیت کی بنیاد وطن نہیں اس کی بنیاد دین ہے۔ خدا کی ہر وہ زمین جہاں مسلمان احکامِ الٰہی کے مطابق زندگی بسر کر سکیں، ان کا وطن ہے۔ یہ قومیت نسل و خون سے بھی بالاتر ہے۔ نیز مہاجرینِ مکہ نے کمال ایثار سے کام لیتے ہوئے اپنے وطن اعزہ اور مال سے دست بردار ہو کر یہ ثابت کر دیا کہ مسلمانوں کے لئے عزیز ترین متاعِ زیست ان کا مذہب ہے اور ان کے سامنے دنیاوی فوائد بے حقیقت اور بے معنی ہیں۔

پاک و ہند میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے اور بہت سی قومیں آئی تھیں لیکن رفتہ رفتہ وہ ہندی معاشرہ میں مدغم ہوتی چلی گئیں اور ان کا منفرد قومی وجود باقی نہ رہا۔ مسلم قوم کی یہ امتیازی خصوصیت تھی کہ اس نے اپنی جداگانہ حیثیت برقرار رکھی۔ نہ صرف یہ کہ ان کی انفرادیت برقرار رہی بلکہ انہوں نے ہندی معاشرے کو بے حد متاثر کیا۔ ہر چند کہ ہندو سماج نے ذات پات کی بندشوں کو کام میں لا کر اپنے آپ کو مسلمانوں سے الگ تھلگ رکھا لیکن وہ اسلامی نظریات اور تہذیبی روایات سے مستفیض ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ نہ صرف یہ کہ کروڑوں کی تعداد میں ہندو مشرف بہ اسلام ہوئے اور خود ہندو مت میں اصلاحی تحریکیں شروع ہو گئیں۔ بھگتی تحریک در حقیقت اسلامی توحید اور مساوات ہی کا ایک عکس تھی۔

جب مسلم حکومت کی مثالی رواداری، مسلم صوفیاء کی وسیع المشربی اور بھگتی تحریک کی تعلیمات کے زیرِ اثر پاک و ہند کے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے قریب آنا شروع ہوئے تو بعض حلقوں میں یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ اسلام اور ہندو مت ایک ہی دریا کی دو نہریں اور ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ اسی خیال کے تحت انہوں نے متحدہ قومیت کا نظریہ عام کرنے کی کوشش کی۔ اکبر کا دینِ الٰہی اسی کوشش کی عملی صورت تھی۔ دارا شکوہ کی تحریریں بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھی۔ لیکن مسلم قوم نے متحدہ قومیت کا نظریہ کبھی قبول نہیں کیا۔ مغلیہ عہد میں حضرت مجدد الف ثانی کی تحریک دو قومی نظریہ کی علمبردار تھی جس نے دین الہی کے اثرات کو محو کر دیا اور مسلمانوں کے مستقل قومی وجود کی صحیح اور موثر انداز میں ترجمانی کی۔ ایک ہندو نے حضرت مجدد کو لکھا کہ رام اور رحمن میں کوئی فرق نہیں تو آپ نے سختی سے اس کی تردید کی۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ متحدہ قومیت کا نظریہ اس لئے مقبول نہ ہو سکا کہ وہ حقیقت کے برعکس تھا۔ اگرچہ بیسویں صدی میں مسلمانوں پر غلبہ حاصل کرنے اور ان کے قومی وجود کو ختم کرنے کی نیت سے ہندوؤں نے اس کا پرچار کیا لیکن عملاً وہ ہر زمانہ میں اس کے خلاف عمل پیرا رہے۔ انہوں نے کبھی مسلم حکومت کو دل سے تسلیم نہیں کیا اور ہمیشہ اس کے خلاف سازشیں کرتے رہے ان کے دلی جذبات کا ترجمان مان سنگھ نہیں بلکہ رانا پرتاپ تھا۔[۱]

ہندوؤں نے مسلمانوں کو ہمیشہ 'ملیچھ' یعنی ناپاک قرار دے کر اپنے لئے ناقابل قبول گردانا اور انہیں غیر کہہ کر 'ہندوستان برائے ہندوستانی' کا نعرہ لگایا۔ مسلمانوں کے عہد اقتدار میں ان کے خلاف مسلسل خونریز جنگیں لڑیں اور انگریزوں کے دور میں بھی ہندوؤں کی مسلم دشمن سرگرمیاں جاری رہیں۔

مذکورہ بالا واقعات کی روشنی میں یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں کہ ہندو اور مسلمان دو الگ قومیں ہیں۔ ماضی میں صدیوں تک ایک ملک میں رہنے کے باوجود جب وہ ایک قوم نہ بن سکے تو یہ کیسے کہا جا سکتا تھا کہ مستقبل میں وہ ایک قوم کی حیثیت سے رہنے لگیں گے۔

عہد جدید میں جب مسلم قوم کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوا تو سر سید احمد خان نے دو قومی نظریہ کو بڑے پرزور الفاظ میں پیش کیا۔ انہوں نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ برصغیر میں ایک قوم آباد نہیں، یہ مختلف اقوام کا مسکن ہے جن کی تہذیب اور مفادات مختلف بلکہ بعض اوقات باہم متصادم ہیں۔

آپ نے مقابلہ کے امتحانات کے بارے میں کہا:۔

"اس امتحان کے لئے ہمارا ملک تیار نہیں ہے ..... مقابلہ کا امتحان اس ملک میں

۱ے تحریک پاکستان ص ۲۹ ، ..... [illegible]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہو سکتا ہے جہاں اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک سب ایک قوم کے آدمی ہوں مگر ہندوستان میں جہاں مختلف قومیں آباد ہیں اور ایک قوم دوسری قوم سے بالکل الگ ہے کسی طرح مقابلہ کا امتحان قرینِ مصلحت نہیں۔ پھر تعلیم و تربیت کے لحاظ سے ہندوستانیوں کی حالت اس قدر مختلف اور متضاد ہے کہ بہت سی قومیں جیسے مسلمان، راجپوت، سکھ اور جاٹ وغیرہ، موجودہ حالت میں کبھی مقابلے کے امتحان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔[۱]

اسی استدلال کی بنا پر انہوں نے مغربی طرزِ جمہوریت کی مخالفت کی آپ نے کہا کہ:۔

"انگلستان اور ہندوستان کے حالات میں بہت فرق ہے۔ انگلستان میں فرقہ وارانہ امتیازات باقی نہیں رہے ہیں تعلیم کے فروغ پانے اور زندگی کے مختلف میدانوں میں ترقی کی وجہ سے مذہبی اختلافات اور دیگر تفرقے کم ہو گئے ہیں۔ قوم اور مذہب کے متحد ہونے سے تمام انگریز ایک قوم ہو گئے ہیں اس لئے جمہوری طریقہ انتخاب کامیاب رہا ہے" لیکن "ایک ایسے ملک میں جیسا ہندوستان ہے جہاں ذات کے اختلافات اب تک موجود ہیں۔ جہاں مختلف قومیں آپس میں خلط ملط نہیں ہوئی ہیں کہ جہاں مذہبی اختلافات اب تک زور و شور پر ہیں اور جہاں تعلیم نے اپنے جدید معنی کے لحاظ سے باشندوں کے تمام فرقوں میں ایک مساوی مناسبت کے ساتھ ترقی نہیں کی، مجھ کو کامل یقین ہے کہ لوکل بورڈوں اور ضلع کونسلوں میں مختلف مطالب کی حمایت کی غرض سے الیکشن کے خالص اور سادہ اصول کے جاری کرنے سے بہ نسبت محض تمدنی خیالات کے زیادہ تر بڑی بڑی خرابیاں پیدا ہوں گی"۔[۲]

سرسید نے مزید کہا کہ اگر الیکشن کا خالص اور سادہ اصول رائج کیا گیا تو بڑی قوم چھوٹی قوم کے مطالب پر بالکل غالب آئے گی اور جاہل آدمی گورنمنٹ کو اس قسم کی تدابیر کو جاری کرنے کا جواب دہ سمجھیں گے۔ جن کے باعث قوم اور مذہب کے اختلافات بہ نسبت سابق کے اور بھی سخت ہو جائیں گے۔[۳]

سرسید کے ان خیالات کا یہ فائدہ ہوا کہ مسلمانوں نے اپنے حقوق اور مفادات کے تحفظ کے لئے الگ سیاسی تنظیم قائم کر لی۔ مسلم لیگ کی اساس ہی دو قومی نظریہ پر تھی اور اس کا پہلا کارنامہ

---

[۱] حیاتِ جاوید ص ۳۱۷ مولانا الطاف حسین حالی [۲] ایضاً ص ۳۲۰-۳۲۱-

[۳] ″ ″ ص ۳۲۰-۳۲۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ تھا کہ اس نے جداگانہ انتخاب کے اصول کو تسلیم کرایا جو فی الحقیقت دو قومی نظریہ کی عمارت کا بنیادی پتھر تھا۔

علامہ اقبال نے اس بات پہ زور دیا کہ مسلم قوم کا اپنا نظریۂ حیات ہے۔ اس کا مذہب، قانون، ادب اور تمدن ہندو قوم سے بالکل مختلف ہے۔ اس لئے انہیں حق پہنچتا ہے کہ اپنے اکثریتی علاقوں میں خود مختار ریاست قائم کریں۔ اور اس میں اپنی روایات، رسوم، تمدن اور مذہب کے مطابق اپنا انفرادی اور اجتماعی نظامِ حیات مرتب کریں۔

مولینا سید ابوالحسن ندوی علامہ اقبال سے اپنی ایک ملاقات کا حال بیان کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ:۔

"۲۲ نومبر ۱۹۲۷ء کو ان سے ایک تفصیلی ملاقات کا موقع ملا۔ ہندوستان میں اسلام کی تجدید و احیاء کی بات نکلی تو شیخ احمد سرہندی، شاہ ولی اللہ اور سلطان محی الدین عالمگیر کی بڑی تعریف کی اور فرمایا۔

"میں ہمیشہ کہتا ہوں کہ اگر ان کا وجود اور ان کی جدوجہد نہ ہوتی تو ہندوستانی تہذیب اور فلسفہ اسلام کو نگل جاتا،" پاکستان کے بارے میں فرمایا جو قوم اپنا ملک نہیں رکھتی وہ اپنے مذہب اور تہذیب کو برقرار نہیں رکھ سکتی۔ دین و تہذیب حکومت و شوکت سے زندہ رہے ہیں اس لئے پاکستان ہی مسلم مسائل کا واحد حل ہے اور یہی اقتصادی مشکلات کا حل بھی ہے[1]۔"

مطالبۂ پاکستان کے اس نظریاتی پہلو کو سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تحریروں سے بھی تقویت ملی۔ ان سے مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کے تصور کو استحکام ملا۔ انہوں نے دین کو ایک جامع اور ہمہ گیر نظامِ زندگی کے طور پر پیش کر کے مسلم قوم کے سامنے فکر کی نئی راہیں کھول دیں۔ آپ نے فرمایا کہ:۔

"ایک وطن کے باشندوں کو محض اس واقعہ کی بنا پر کہ وہ ایک وطن کے باشندے ہیں تمام حیثیات سے ایک سمجھ لینا اور اس مفروضہ پر ملک کی آزادی کو ان سب کے لئے یکساں آزادی قرار دینا یا تو جہالت ہے یا خطرناک قسم کی چالاکی۔ بہت سے لوگ اس مفروضہ کو سامنے رکھ کر

---

[1] نقوش اقبال ص۱۱ مولانا ابوالحسن ندوی لکھنؤ ۱۹۷۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بے تکلف کہے جاتے ہیں کہ جب ملک آزاد ہوگا تو سب آزاد ہو جائیں گے لیکن یہ مفروضہ ہر حال میں اور ہر جگہ صحیح نہیں ہو سکتا۔ جس ملک کے باشندوں میں ایک سے زیادہ گروہ موجود ہوں اور ان کے درمیان نسل یا رنگ یا زبان یا عقائد، جذبات اور طرزِ زندگی کے مابین اختلافات موجود ہوں وہاں اس امر کا امکان ہے کہ آزادی کی دولت کو ایک گروہ اچک لے اور دوسرے گروہ یا گروہوں کو اس سے محروم کر دے۔[۵۱]

ہندوؤں اور کانگرس کی تنگ نظری اور متعصبانہ رویّہ نے مسلمانوں کے ذہنوں پر گہرا اثر ڈالا۔ سر سید احمد خان، مولانا محمد علی جوہر، علامہ اقبال اور قائد اعظم نے اپنی سیاست کا آغاز ہندو مسلم اتحاد قائم کرنے کی کوششوں سے کیا تھا لیکن ہندوؤں کے معاندانہ رویّہ نے اس حد تک دل برداشتہ کر دیا کہ انہوں نے اتحاد کی کوششیں ترک کر دیں۔ ہندوؤں نے اردو زبان، تقسیم بنگال اور جداگانہ انتخاب کے اصول کی مخالفت محض اس لئے کی کہ وہ مسلمانوں کو ایک علیحدہ اور خوشحال قوم دیکھنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ معاہدہ لکھنؤ ۱۹۱۶ء میں کانگرس اور مسلم لیگ نے ایک مشترکہ دستاویز تیار کی تھی جس میں مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخاب، مرکزی اسمبلی میں ایک تہائی نمائندگی اور نمائندگی کے سوال پر مذہبی اقلیتوں سے ترجیحی سلوک کا وعدہ کیا گیا تھا لیکن اب کانگرس نے نہرو رپورٹ ۲۸-۱۹۲۷ء میں ان سب کو اس طرح یک قلم موقوف کر دیا جیسے وہ کبھی ان پر عمل پیرا ہونے کے لئے رضامند نہیں ہوئی تھی۔

دوسری طرف کانگرسی حکومت نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ایسے اقدامات کئے جن سے مسلمانوں پر معاشی دباؤ پڑا۔ ایسے کاروبار جو زیادہ تر مسلمانوں کے ہاتھ میں تھے، بھاری ٹیکسوں کی زد میں آگئے۔ سماجی بہبود کے منصوبوں میں مسلمانوں کو کوئی حصہ نہیں ملتا تھا۔ سرکاری ملازمتوں اور پیشہ وارانہ تربیت کے اداروں میں داخلہ سے انہیں محروم رکھا جاتا تھا۔ حکومت کی اہم اسامیوں سے انہیں ہٹایا جانے لگا۔

مزارعین کی حالت سدھارنے کے لئے جب حکومت بنگال نے اسمبلی میں بل پیش کیا تو کانگرس نے شدید مخالفت کی کیونکہ بنگال میں بڑے زمیندار زیادہ تر ہندو تھے اور مزارعین

[۵۱] تحریک آزادی ہند اور مسلمان صفحہ [illegible]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ اس کے برعکس یوپی میں کانگرس نے اس قسم کا بل پاس کرنے پر اصرار کیا کیونکہ یہاں بڑے زمینداروں میں مسلمانوں کی تعداد کافی تھی۔[۱]

صوبوں میں مسلمانوں کو ہندو راج کا جو تجربہ ہُوا وہ اس قدر تلخ تھا کہ ان کے دل میں ہندوؤں کے متعلق بے شمار خدشات پیدا ہو گئے۔ اُنہوں نے سوچنا شروع کر دیا کہ انگریزوں کی موجودگی میں محض محدود اختیارات حاصل کر کے ہندوؤں نے ان سے یہ سلوک روا رکھا ہے تو حصُولِ آزادی کے بعد جب فی الواقع اقتدار ان کے ہاتھ میں آجائے گا تو وُہ کیا کچھ نہیں کریں گے اس طرح کانگرس نے انہیں علیحدگی پسندی کے راستے پر ڈال دیا اور وُہ بالآخر ایسے مقام تک پہنچ گئے جہاں سے پسپائی ناممکن تھی۔

کانگرس کا رویّہ اور ہندو راج مسلمانوں کی قومی زندگی کے لئے ایک نعمت ثابت ہُوا۔ اس سے مسلمانوں کے اندرونی اختلافات تیزی سے ختم ہونے لگے اور وہ مسلم لیگ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہونے لگے۔ مسلم لیگ زبردست عوامی جماعت بننے لگی۔ کانگرس نے گاندھی کو جو مقام دے رکھا تھا وہ اب مسلم لیگ میں مسٹر جناح کو حاصل ہو گیا۔ اب وہ مسٹر جناح نہیں رہے بلکہ قوم کے قائدِ اعظمؒ تھے۔

۲۲۔ مارچ ۱۹۴۰ء کو قائدِ اعظمؒ نے دو قومی نظریہ پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا۔

"ہندوستان کا مسئلہ فرقہ وارانہ نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے اور اس مسئلہ کو بین الاقوامی مان کر حل کرنا چاہیئے۔ اگر برطانوی حکومت یہ چاہتی ہے کہ ہندوستانیوں کو امن و سکون حاصل ہو تو اس کی صرف ایک صورت ہے کہ ہندوستان کو تقسیم کر کے جداگانہ قومی وطن منظور کئے جائیں۔ ہندو اور مسلمان کبھی ایک قوم نہیں بنے نہ دونوں کے درمیان شادیاں ہوتی ہیں، نہ ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں ایسی تہذیبوں کے ماننے والے ہیں۔ جن کی بنیاد متصادم افکار و تصورات پر ہے۔ ان کے کارنامے مختلف ہیں۔ اکثر اوقات ایک کا ہیرو دوسرے کا دشمن ہوتا ہے۔ ایک کی فتح دوسرے کی شکست ہوتی ہے۔ ایسی قوموں کو ایک ایسے نظام میں باندھنا جس میں ایک اقلیت ہو اور دوسری اکثریت، اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ان میں بے چینی بڑھے گی اور بالآخر وہ نظام تباہ و برباد ہو جائے گا۔"

---

[۱] تحریکِ پاکستان ... صابر ... مطبوعہ لاہور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قائداعظمؒ نے اس غلط فہمی کی تردید کی کہ مسلمان ایک اقلیت ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ "مسلمان اقلیت نہیں بلکہ وہ قومیت کی ہر تعریف کی رو سے ایک قوم ہیں اور ان کا ایک علاقہ اور وطن ہونا چاہیئے۔"

قائداعظمؒ نے اس تقریر کے دوران لالہ لاجپت رائے کا ایک خط پڑھ کر سنایا جو انہوں نے ۱۹۲۴ء میں سی۔آر۔داس کو لکھا تھا کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں اور ان دونوں کو مدغم کر کے ایک قوم بنانا بالکل ناممکن ہے۔ لالہ لاجپت رائے چونکہ ہندو ذہنیت کے صحیح ترجمان سمجھے جاتے تھے۔ اس لئے ان کے خط نے لوگوں کو ششدر کر دیا۔ ملک برکت علی مرحوم سٹیج پر بیٹھے ہوتے تھے ان کے منہ سے نکل گیا کہ لالہ لاجپت رائے نیشنلسٹ ہندو تھے۔ اس پر قائداعظمؒ نے زور سے کہا کہ کوئی ہندو نیشنلسٹ نہیں ہو سکتا۔ ہر ہندو اوّل اور آخر ہندو ہے۔[۵]

دو قومی نظریئے کی بنیاد پر مسلمانوں نے مسلم لیگ کے زیرِ سایہ ایک قوم کی حیثیت سے جدوجہد شروع کی۔ ہندوؤں کی طرف سے نفرت اور ہٹ دھرمی نے انہیں پہلے سے کہیں زیادہ متحرک اور فعّال بنا دیا۔ بالآخر مسلمانوں نے علیحدہ وطن کا مطالبہ کیا جو ان کی تمام تر کوششوں کا محور تھا۔

اگر ہندو یا انگریز مسلمانوں سے سو فیصد اچھا سلوک کرتے اور تنگ نظری کا مظاہرہ بھی نہ کرتے تب بھی بہر صورت قیام پاکستان ناگزیر تھا جو فی الحقیقت مسلمانوں کے جذبات اور امنگوں کا آخری ترجمان تھا اور اس سے ہٹ کر کسی قسم کی سکیم بھی ان کے لئے قابلِ عمل یا قابلِ قبول نہیں تھی۔

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور کے تاریخی اجلاس میں جو قرارداد پیش کی گئی اس کا متن یہ تھا۔

"قرار پایا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کی رائے یہ ہے کہ کوئی بھی آئینی منصوبہ اس ملک میں قابلِ عمل نہیں ہوگا جب تک کہ وہ مندرجہ ذیل بنیادی اصولوں پر مبنی نہ ہو۔ یعنی یہ کہ

---

۵ چند یادیں چند تاثرات ص ۲۴۵ عاشق حسین بٹالوی لاہور ۱۹۶۹ء

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جغرافیائی حیثیت سے ایسے متصل علاقے جن کی ضرورت کے مطابق ملکی لحاظ سے اس طرح حد بندی کر دی گئی ہو کہ جن علاقوں میں تعداد کے اعتبار سے مسلمانوں کی اکثریت ہے جیسا کہ شمال مغربی اور مشرقی حصوں میں ہے وہ خود مختار حکومت قرار دے دیئے جائیں اور ان علاقوں کے اجزائے ترکیبی اندرونی طور پر خود مختار اور با اختیار ہوں۔"

قرارداد کی تائید چوہدری خلیق الزماں، مولانا ظفر علی خاں، آئی۔آئی چندریگر، مولانا عبدالحامد بدایونی اور بیگم محمد علی جوہر وغیرہ نے کی۔ بیگم محمد علی جوہر نے اپنی تقریر میں پاکستان کا لفظ استعمال کیا۔[1] اس قرارداد کے بعد مسلم لیگ کی حکمت عملی میں کوئی ابہام باقی نہ رہا۔ اس کے نزدیک تمام مسائل کا واحد حل ملک کی تقسیم تھا۔ اس کے علاوہ کسی اور تجویز پر غور ناممکن تھا۔

قائداعظم نے نفاذِ شریعت کو پاکستان کا مقصد قرار دیتے ہوئے فرمایا:-

"پاکستان کی سکیم کو پیش کرنے میں ایک ہی بنیادی اصول میرے پیش نظر تھا یعنی اسلامی جمہوریت کا اصول، میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات اس میں مضمر ہے کہ ہم ان بیش بہا اصولوں کی پیروی کریں جو ہمارے عظیم المرتبت قانون دہندہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لئے وضع کر دیئے ہیں۔ آیئے ہم اپنی جمہوریت کی اساس سچے اسلامی تصورات اور اصولوں پر قائم کریں۔ ہمارے اللہ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم اپنے امور حکومت باہمی مشوروں سے طے کیا کریں۔"

تقریر فروری ۱۹۴۸ء

پاکستان شرعی نقطہ نظر سے:-

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے جمعیت العلمائے اسلام کے سالانہ اجلاس منعقدہ کلکتہ میں فرمایا۔

"میں زمانہ دراز تک ان مسائل کی اطراف وجوانب پر غور کرتا رہا ہوں اور آخر کار اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس وقت مسلمانوں کو حصول پاکستان کی خاطر مسلم لیگ کی تائید وحمایت میں حدودِ شرعی کی رعایت کے ساتھ حصہ لینا چاہیئے۔"[2]

---

[1] تحریک پاکستان ص۲۲۶ از صاحبزادہ عبدالرسول بحوالہ "پاکستان ناگزیر تھا" از سید حسن ریاض

[2] پیغام شیخ الاسلام ص۲۲ [illegible]

© rasailojaraid.com